تفسیر احمد

سُورَةُ البَلَد

Ketabton.com

جزء - 30

سوره «البلد» کا تفسیر و ترجمہ

تصنیف: امین الدین « سعیدي - سعید افغانی»

(c) ketabton.com: The Digital Library

بسم الله الرحمن الرحيم
سورة البلد
جزء ٣٠

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی، اس کی 20 آیتیں ہیں

وجه تسمیه:

اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع میں بلد حرام (مکہ مکرمہ) کی قسم کھائی ہے، اس وجہ سے اس سورت کو "سورة البلد" کے نام سے موسوم کیا گیا، یہ سورت سورہ "ق" کے بعد نازل ہوئی ہے۔

سورة البلد کی آیات، الفاظ اور حروف کی تعداد

اس سورہ کا نام سورۃ البلد ہے جو کہ سورت کی پہلی آیت سے لیا گیا ہے، یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس کا ایک (1) رکوع، بیس (20) آیتیں، بیاسی (82) الفاظ، تین سو سینتالیس (347) حروف اور ایک سو اڑسٹھ (168) نقطے ہیں۔ (یادر ہے کہ سورتوں کے حروف کی تعداد میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، اس کی تفصیل کے لیے سورہ "طور" تفسیر احمد کی طرف رجوع کریں)

سورة البلد کا سورة الفجر سے ربط و مناسبت

الف: سورۂ فجر میں دوستوں اور ورثاء کی جائیدادوں کو غصب کرنے والوں کی مذمت کی گئی ہے، کیونکہ یہ لوگ غریبوں اور مسکینوں کی طرف توجہ نہیں کرتے اور کسی کو مدد پہنچانے کی ترغیب اور تشویق نہیں کرتے، سورہ بلد میں غلاموں کو آزاد کرنے، قحط اور خشک سالی میں کھانا کھلانے اور یتیموں کی مدد کرنے جیسی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔

ب: سورۂ فجر کے آخر میں نفس مطمئنہ کا ذکر ہوا، سورۂ بلد میں بھی اطمینان اور بھروسہ کرنےکی ترغیب اور مایوسی، کفر اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

سورة "البلد" سے اخذ کردہ نکات

قابل ذکر بات یہ ہے کہ:

اس سورت میں ایک بہت ہی معنی خیز موضوع کو چند مختصر جملوں میں سمویا گیا ہے، جس سے قرآن کے اختصار کا کمال ثابت ہوتا ہے، کہ ایک مکمل عالمی نظریہ جسے کسی بڑی کتاب میں سمیٹنا مشکل ہے کو مختصر سطروں میں مؤثر طریقے سے بیان کیا گیا ہے، اس کا موضوع دنیا میں انسان کے صحیح مقام اور انسان کے لیے دنیا کے صحیح مقام کو سمجھنا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے سعادت اور بدبختی کے دونوں راستے کھلے رکھے ہیں، اس نے اسے دونوں راستوں کو دیکھنے اور ان پر چلنے کے ذرائع بھی

(c) ketabton.com: The Digital Library

فراہم کردیے ہیں، اور اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر منحصر ہے کہ وہ سعادت کی راہ پر گامزن ہوکر اچھے انجام کو پہنچتا ہےیا بد بختی اور شقاوت کا راستہ اختیار کرکے بُرے انجام میں مبتلا ہوتاہے ۔
اس سورہ مبارکہ میں بیان ہوتا ہے کہ: انسان رنج، مشقت اور سختیوں میں پیدا ہوا ہے، اسے ساری زندگی مشقتیں برداشت کرنی چاہیے، پس کیا ہی بہتر ہے کہ دنیا کی سختیوں کے بوجھ تلے دب جائے تاکہ آخرت تک آسانی سے پہنچ سکے، ورنہ اس کی آخرت بھی اس کی دنیا کی طرح سختیوں سے بھری ہوگی۔
یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل خدا کی طرف سے امتحان ہے، اس آزمائش سے صبر و تحمل کے ساتھ نکلنا چاہیے، مسائل کے ظاہر کو نہ دیکھیں، اپنی زندگی کے واقعات کے معنوی نتائج اور آخروی زندگی کے اثرات پر بھی توجہ دیں، زندگی ہمیشہ مصائب اور پریشانیوں سے بھری ہوئی ہے، اور بنیادی طور پر زندگی میں مسائل اللہ کی طرف سے امتحان کی ایک قسم ہے، خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: (وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٖ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ‌ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَۙ‏ ○١٥٥)(سورہ بقرہ:155)
ترجمہ:"اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو"
(الَّذِىۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡغَفُوۡرُۙ‏ ○٢)(سورة الملک:2)
ترجمہ:"اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے"
اہل سیر لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے دوسروں کی بہ نسبت سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا کیا، قرآن کریم میں اللہ فرماتاہے: "اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ يُسۡرًا"
اگر ہم آیت کریمہ میں گہری نظر سے توجہ کریں ہم اسے واضح طور پر سمجھ جائیں گے: کہ آیت شریفہ میں سختیوں کو برداشت کرنے اور آسانی کے حصول کے درمیان ایک تعلق اور باہم ربط ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص مشکل کے بعد اتفاقاً آسانی حاصل کرے، لہٰذا "عسر اور یسر" کے درمیان تعلق کے لیے ایسے لفظ کا استعمال کیا جائے جس میں یہ معنی موجود ہو، اور وہ لفظ (مع) ہے۔
لفظ (مع) کے استعمال کے لیے مفسرین کے جانب سے متعدد تفسیریں کی گئی ہیں:
(١):لفظ "مع" کے ساتھ ایک آیت ذکر کرنے کا یہ ہےکہ ہم انسانوں کو یہ جسے

(c) ketabton.com: The Digital Library

بھولنا نہیں چاہیے کہ آسانی اور تکلیف ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، مشکل لمحات کو برداشت کرنے سے آسانی آہستہ آہستہ حاصل کی جاتی ہے۔
(۲): لفظ "مع" کے استعمال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آسانی مشکل کے قریب ہے، اس طرح بیان کرنے سے سکون ملتا ہے اور حوصلے کو تقویت ملتی ہے۔
بہ ہر حال اس بنا پر کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ملی ہوئی اور ہر صعوبت کے ساتھ سہولت ہے، یہ دونوں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں اور ساتھ رہیں گے، (بعد) کا لفظ استعمال کرنے سے یہ لطیف معنی نہیں بنتا (چنانچہ لفظ مع کا جو لوگ ترجمہ بعد کا کرتے ہیں وہ اس لفظ کے استعمال کی لطافت سے لا علم ہیں ۔
اللہ تعالیٰ اس آیت میں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرکے فرماتے ہیں: پس (جان لیں) کہ یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔
جس نبی کو مکہ میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ظاہرہے کہ خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ مدینے میں اس کے لیے آسانیاں ہوں گی یا جن مشکلات اور سختیوں کے ساتھ وہ دنیا میں ہیں، جنت میں ان کے لیے آسانی ہوگی، البتہ آیات کے مفہوم کی وسعت تمام مسائل کو شامل ہے، یعنی یہ دونوں آیات اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ یہ نہ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں اور نہ آپ کے زمانے کے ساتھ، بلکہ اسے ایک کلی قاعدے کے طور پر اور پچھلے موضوعات کی وضاحت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور وہ تمام دیانتدار، مخلص اور محنتی لوگوں سے وعدہ کرتا ہے کہ مشکلات کے ساتھ ساتھ ہمیشہ آسانیاں بھی ہوتی ہیں۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

سورۃ البلد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِۙ○۱ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِۙ○۲ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَۙ○۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍؕ○۴
اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌۘ○۵ یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًاؕ○۶ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِۙ○۸ وَلِسَانًا
وَّشَفَتَیْنِۙ○۹ وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِۚ○۱۰ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ○۱۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُؕ○۱۲ فَكُّ رَقَبَةٍۙ○۱۳ اَوْ
اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍۙ○۱۴ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍۙ○۱۵ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍؕ○۱۶ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِؕ○۱۷ اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِؕ○۱۸ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ
الْمَشْـَٔمَةِؕ○۱۹ عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ○۲۰

سورت کا مختصر ترجمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع کرتاھوں اللہ کے نام سے جوبڑا مھربان نھایت رحم والاھے
لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِۙ○۱	میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں!(1)
وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِۙ○۲	اور تو رہنے والا ہے اس شہر میں (2)
وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَۙ○۳	اور قسم ہے باپ (یعنی آدم) اور اس کے اولاد کی (3)
لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍؕ○۴	یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے (4)
اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌۘ○۵	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قادر نہیں ہوگا؟ (5)
یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًاؕ○۶	کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال برباد کیا (6)
اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌؕ○۷	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ (7)
اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِۙ○۸	کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں (8)
وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِۙ○۹	اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دئیے) (9)

(c) ketabton.com: The Digital Library

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ﴿۱۰﴾	اور ہم نے اسے دو واضح راستے (خیر اور شر) دکھا دیے (10)
فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ﴿۱۱﴾	پھر (بھی) وہ مشکل گھاٹی میں نہ (قدم رکھا) گھسا (11)
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾	اور تمہیں کیا پتہ کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ (12)
فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾	کسی گردن کو (غلامی سے) آزاد کرنا ہے (13)
اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾	یا کسی بھوک والے دن کھانا کھلانا (14)
يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ﴿۱۵﴾	کسی قرابت والے یتیم کو (15)
اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۙ﴿۱۶﴾	یا مٹی میں ملے ہوئے کسی مسکین کو (١٦)
ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۭ﴿۱۷﴾	پھر ہوئے وہ ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی (١٧)
اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۭ﴿۱۸﴾	یہی لوگ صاحب سعادت ہیں (١٨)
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔـمَةِ ۭ﴿۱۹﴾	اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا وہ بدبخت ہیں (١٩)
عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾	ان پر (ہر طرف سے) آگ بند کی جائے گی (٢٠)

مختصر تفسیر

مبارک آیات (1 تا 7) میں انسان کے مصائب و مشکلات کے ساتھ جڑے رہنے کی بات کی گئی ہے اور ساتھ ہی، طاقت اور دولت کے ذریعے اس کے بہکانے جائے جانےکے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

جانناچاہیے کہ: سورہ مبارکہ کی ابتداءقسم سے ہوتی ہے، اور اس کے بعدانسان کے نظام توالد اور تناسل کی طرف اشارہ کرکے اس دنیا کی زندگی کو محنت اور مشقت سے متعارف کراتی ہے، پھر وہ غافل اور متکبر لوگوں کو قابل سرزنش ٹھہراتی ہے، اللہ تعالیٰ کی قیمتی نعمتوں کی نشاندہی کرتی ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہیں، اور ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مستحقین کا خیال رکھا جائے اور یتیموں کی مدد کی جائے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

بلاشبہ نعمتوں کے معاملے میں لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں، شکر گزار گروہ کا انجام خوشگوار اور مبارک ہوگا جبکہ ناشکرے گروہ کا انجام عبرتناک اور سخت ہوگا۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِۙ○	میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں!(1)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر یعنی: حرمت والے شہر مکہ مکرمہ کی، وہ شہر جو حرم الٰہی ہے ، اورنزول وحی کا مقام، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور مناسک حج کی جگہ ہے، وہ جو بیت العتیق (جسے قبلہ بناکرشرق اور غرب کا)معزز ترین اور بابرکت مقام بنادیا گیا ہے، اسے رحمتوں اور برکتوں کے نزول کی جگہ قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ سورت کے شروع میں مکہ شہر کی قسم کھاتا ہے،یہ اس سرزمین کے شرف اور احترام کی خاطر، کہ اللہ تعالیٰ کا گھر اس میں واقع ہے اور اللہ کا سب سے محبوب ترین مقام ہے، اس مکان کی فضیلت اور برتری سب پر واضح ہے، اس مقام اور خانہ کعبہ میں دعا رد نہیں کی جاتی بلکہ قبول ہوجاتی ہے، اُس صورت میں کہ دعا کرنے والا اپنی دعا کی قبولیت پر یقین رکھتا ہو۔

اس آیت میں حروف "لا" زائد ہے، بعض محاورات میں عرب کے نزدیک حرف زائد "لا" لانا معمول ہے۔

صحیح ترین قول یہ ہے کہ حرف "لا" مخاطب کے خیال باطل کو رد کرنے کے لیے ہے، قسم کے شروع میں لایا جاتا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ جیسا کہ تم سوچتے آئے ہو ایسا نہیں ہے، بلکہ ہم قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ: اس کی حقیقت وہ ہے جو ہم بیان کررہے ہیں، جیسا کہ ہم نے کہا: "البلد" سے مراد مکہ شہر ہے، اسی طرح سورہ "والتین" میں بھی شہر کی قسم کھائی گئی ہے، اس صفت کے ساتھ اسے امین کہاگیا: (وهذا البلد الامين) شہر مکہ کی قسم کھانا دوسرے شہروں کی بہ نسبت اس کے شرف اور فضیلت کا اظہار اور اعلان کرنا ہے۔

التسهيل میں ہے کہ: اکثر مفسرین کا اتفاق رائے ہے کہ "بلد" سے مراد شہر مکہ ہے، اس کی قسم کھائی ہے تاکہ اس کی عزت پر دلالت کرے۔(التسهيل:199/4)

حضرت عبد اللہ بن عدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت شہر مکہ سے خطاب کرکے فرمایا: اللہ کی قسم! تو اللہ کے نزدیک تمام زمین سے زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے، اگر مجھ پر یہاں سے نکلنے کا دباؤ نہ ہوتا، تو میں تیری زمین سے باہر نہ جاتا (رواہ الترمذی و ابن ماجہ)

(c) ketabton.com: The Digital Library

ملاحظہ :

قرآن عظیم میں جملہ "لَآ اُقۡسِمُ" تین بار مستعمل ہوا ہے، مفسرین نے اس کے دو مفہوم اور معنی بیان کیے ہیں، کچھ مفسرین حرف "لا" کو زائد سمجھتے ہیں اور اس کا معنی (قسم کھاتا ہوں) کرتے ہیں اور کچھ نے اسے (قسم نہیں کھاتا ہوں) ترجمہ کیا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ مسئلہ اس قدر واضح اور روشن ہے کہ قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِۙ۲	اور تو رہنے والا ہے اس شہر میں (2)

لفظ "حِلٌّ" میں دو معنی کا احتمال ہے: ایک یہ کہ حلول سے مشتق ہو، کہ متبادل، رہائش اختیار کرنا، اور اترنے جیسے معنی میں آتا ہے، تو اس کے مطابق "حِلٌّ"کا معنی اترنے کا ہے اور سکونت اختیار کرنے کا معنی بھی آتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شہر مکہ خود محترم اور مقدس ہے، خصوصاً جب آپ اس میں رہائش رکھتے ہوں، پس مکین کی فضیلت سے مکان کی فضیلت میں اضافہ ہوتا ہے، اس بناء پر شہر کی عظمت اور تقدس آپ کی سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے دوگنا اور دوبالا ہوجاتا ہے، اور دوسرا امکان یہ ہے کہ لفظ "حِلٌّ" مصدر "حلت" سے مشتق ہو، جوکہ حلال ہونے کے معنی میں ہے، اس لحاظ سے لفظ "حِلٌّ" کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ کفار مکہ نے آپ کے قتل کو حلال قرار دیا ہے اور وہ آپ کو قتل کرنے کے درپے ہیں، حالانکہ وہ خود مکہ شہر میں کسی بھی قسم کے شکار کو جائز نہیں سمجھتے ، لیکن ان کا ظلم اور سرکشی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ جس مقدس مقام پر کسی جانور کا قتل جائز نہیں ہے جوکہ ان کا بھی عقیدہ اور ماننا ہے، اُس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خون گرانے کا حلال قرار دیا ہے۔

"حِلٌّ" کا دوسرا معنی یہ ہوسکتا ہے کہ: آپ کی خصوصیت یہ ہے کہ حرم میں کفار مکہ سےلڑنا آپ کے لیے حلال ہوگا، جیسا کہ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ایک دن کے لیے حرمت کے احکام اٹھا لیے گئے، اور کفار کا قتل حلال قرار پاگیا۔

خلاصہ تفسیر میں یہی تیسرے معنی کو مدنظر رکھا گیا ہے، لیکن تفسیر "مظہری" میں تینوں احتمالات کا ذکر کیا گیا ہے، اور تینوں معنی کی گنجائش ہے -

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَۙ۳	اور قسم ہے باپ (یعنی آدم) اور اس کے اولاد کی (3)

(c) ketabton.com: The Digital Library

آدم سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہے تمام بنی آدم کے باپ ہیں اور "مَا وَلَدَ" سے مراد اس کی اولاد ہے، جو ابتدائی پیدائش سے قیامت تک ہیں، اس صورت میں حضرت آدم اور تمام بنی نوع انسان کی قسم کھائی گئی۔

مجاہد نے کہا: "وَالِدٍ" یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور "مَا وَلَدَ" اس کی نیک اولاد ہیں۔

ابن کثیر نے کہا: مجاہد اور اس کے دوستوں کی رائے اچھی اور پختہ ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اُم القری کی قسم کھائی، جوکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سکونت کی جگہ ہے، پھر اس کے باشندے آدم اور ان کے بیٹے کی قسم کھائی۔ (مختصر:630/3)

خازن نے کہا: خدا نے مکہ کی عزت اور شرف کی قسم کھائی ہے، اور آدم، اور دیگرپیغمبروں اور ان کی نیک اولاد کی قسم کھائی ہے، کیونکہ کافر- اگر چہ وہ آدم کی نسل سے ہے- کی کوئی عزت نہیں ہے (خازن:248/4)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ﴿٤﴾	یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے (4)

كَبَدٍ: کبد یا کباد کا معنی درد اور سختی کے ہے، جب کہا جاتا ہے کہ: "كَبَدَ رَجُلٌ" یعنی اس آدمی کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، یعنی: ان متذکرہ چیزوں کی قسم: کہ انسان مسلسل دنیا کی تکلیف اور مشقتوں میں ہے اور اس کی سختیوں کو برداشت کرتا ہے، انسان کی تخلیق کے آغاز سے ، یعنی اس کے جسم میں روح پھونکنے سے لے کر جب تک وہ اس سے لی نہیں جاتی، وہ ہر طرح کی سختیوں کو مسلسل برداشت کرتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "فِي كَبَدٍ" یعنی: مشقت اور سختی، حمل، ولادت، بچپن اور دودھ چھڑانے سے لے کر زندگی کے دیگر مراحل زندگی اور موت تک مشکل میں ہے، (خازن:248/4)

کہنے لگے: اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی مخلوق نہیں بنائی کہ انسان جتنی تکلیف اور مشقت اٹھائے، باوجود اس کے کہ انسان سب سے کمزور مخلوق ہے، (خازن:248/4)

ابو سعود فرماتے ہیں: یہ مبارک آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی طرف سے پیش آنے والی مشکلات پر تسلی دیتی ہے، اور ان مشکلات کو برداشت کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انسانی طبیعت کی خبر دیتا ہے، وہ انسان جو خدا کی قدرت کا انکار اور حشر و نشر کو جھٹلاتا ہے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ يَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ اَحَدٌ‌ۘ‏	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قادر نہیں ہوگا؟ (5)

کیا انسان گمان کرتا ہے کہ کوئی بھی اس سے انتقام نہیں لے سکتا کہ اس پر غالب ہو؟ وہ اس مال پر جو اپنی نفسانی خواہشات پر خرچ کرتا ہے فخر کرتا ہے، یہ جہالت ، غرور اور خود غرضی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس پر غالب آئے گا، اور اس سے انتقام لے گا۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت: "ابی الاشد بن کلدۃ" کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جو اپنی جسمانی طاقت پر بہت فخر کرتا تھا، کہتے ہیں کہ: وہ ایک کھال کو بچھا کر اس پر پاؤں رکھتا اور کہتا کہ: جو بھی اسے میرے پاؤں کے نیچے سے گھسیٹ لے یا مجھے اس پر سے ہٹا لے تو میں اسے اتنی رقم دوں گا، دس بندے کھال کو کھینچتے تھے چمڑا ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا لیکن اس کا پاؤں اس سے نہیں ہلتا تھا۔

آیت کا معنی اس طرح ہے: کیا یہ سرکش، نافرمان اور مؤمنوں کو ذلیل کرنے والے سمجھتے ہیں کہ ان سے انتقام لینے کی طاقت کسی میں نہیں ہے؟

يَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ‏	کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال برباد کیا (6)

یہ کافر کہتا ہے: میں نے ڈھیر سارا مال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں خرچ کیاہے، یعنی: میں نے بہت سا مال خرچ کیا ہے جو اتنا زیادہ ہے مگرپھربھی اس کے ختم ہونے کا اندیشہ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی اور دشمنی میں، اسلام کی مخالفت اور نافرمانی میں، یا شہرت کے لیے اور فخر کی خاطر۔

مقاتل اس آیت کے شان نزول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: یہ آیت عامر بن نوفل کے بارے میں نازل ہوئی ہے جوکہ ایک گناہ کا مرتکب ہو ا، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ کفارہ ادا کرے۔

کہا: جب سے میں محمد کے دین میں داخل ہوا ہوں، میرا تمام مال کفاروں اور خیراتوں میں چلا گیا، اس کی یہ بات ایک قسم کی بغاوت تھی، یا اپنے مال کے جانے پر افسوس کا اظہار تھا، جو ہر حال میں مال خرچ کرنے پر اس کے پچھتاوے کا عکاس ہے، مفسر آلوسی فرماتے ہیں: یعنی وہ شیخی مار کر اور گھمنڈ سے مؤمنوں کو کہتا: میں نے بہت سارا مال خرچ کیا، اس کا مقصد وہ مال ہے جو اس نےدکھلاوے کے طور پر اور شہرت حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا تھا، اس نے انفاق کو اہلاک سے تعبیر کیا ہے، فائدہ حاصل کرنے کے لیے

(c) ketabton.com: The Digital Library

خرچ نہیں کیا، اس نے ایسا سوچا گویا کہ اس نے بہت سا مال ضائع کردیا ہے۔
کچھ لوگوں نے کہا ہے: وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی شدید دشمنی ظاہر کرنے کے لیے اس طرح کہتا ہے (آلوسی: 136/30)
اللہ تعالیٰ نے خواہشات اور گناہوں کے راستے میں خرچ کرنے کو ہلاکت کہا ہے، کیونکہ خرچ کرنے والے اس خرچ سے سوائے ندامت، نقصان، پچھتاوے اور کوتاہی کے کوئی فائدہ نہیں ملتا۔
لیکن جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنا مال و جائیداد خرچ کیا ہو تو اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجارت والا معاملہ کیا ہے اور جتنا اس نے خرچ کیا ہے اس سے کئی گنا بڑا فائدہ حاصل کرے گا۔
"اَهۡلَكۡتُ" مال کا تباہ و برباد اور ہلاک کرنا، مراد خرچ کرنا ہے۔
"لُّبَدًا" زیادہ اور بکثرت، "اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا" ایسے کافر اور کافروں کا مقصد مال کی فروانی پر فخر کرنا اور لوگوں کو بلا سوچے سمجھے دینا اور بہت زیادہ مال خرچ کرنا ہے۔

اَيَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ يَرَهٗۤ اَحَدٌؕ﴿۷﴾	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ (7)

کیا یہ متکبر اور مغرور شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی کو اس معاملے کی حقیقت اور اس کے خرچ کی مقدار کا علم نہیں ہوگا؟ اور خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ ہے؟
اللہ تعالیٰ اس آیت مبارکہ میں اس شخص کو جو خواہشات کے راستے میں اپنا مال خرچ کرتا ہے، اور پھر اپنے اس کام پر فخر کرتا ہے تو اللہ اسے سرزنش کررھا ہے کہ کیا اس کاخیال ہے کہ خدا اسے نہیں دیکھتا اور اس کے مقاصد سے باخبر نہیں ہے؟ اس کے اعمال کا حساب و کتاب نہیں کرےگا، ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے اور اس کے اعمال کو محفوظ کرکے اسے اس کا بدلہ دے گا، کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جس اللہ تعالیٰ نے انسان کو سننے اور دیکھنے کے ذرائع عطا کیے ہوں اور خود ان سے محروم ہو؟
مفسرین لکھتے ہیں کہ: اس آیت سے مراد ایک شخص "ابوالاشدّین" کے نام سے ہے کہ اپنے مال اور جائیداد کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے دشمنی میں بڑے فخر سے خرچ کرتا تھا۔

ملاحظہ:

مفسرین کی بڑی تعداد کی رائے ہے کہ اس کا ہدف اور مقصد کوئی معین اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

معلوم شخص نہیں ہے، لیکن بعض علماء کا یہ ماننا ہے کہ یہ شخص "أبو الاشدّين أسيد بن كلدة الجمحي" ہے اس بارے میں ایک روایت بلاسند کے ابن عباس سے تفسیر قرطبی "الجامع لا حکام القرآن 20 / 64" میں ذکر ہوئی ہے، جس کو اس آیت مبارکہ سے مربوط مانتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

محترم قارئین:

آیات مبارکہ (۸ تا 20) میں آخرت کے لیے نجات کے راستے کے انتخاب اور اختیار کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝٨	کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں (8)

کہ اس کے ذریعے دیکھتا ہے؟ جی ہاں! انسان کی بینائی ایک بڑی نعمت ہے، کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے زندگی کے اسباب اور ضروریات کو دیکھتا ہے تاکہ اس کا وجود ان ضروریات اور اسباب کے ذریعے سے قائم رہے۔

"عَيْنَيْنِ" عین کے مادے سے ہے، اس کا مطلب بصارت کا ذریعہ ہے، یعنی: آنکھ؛ البتہ اسے مختلف معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے، جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں میری نظروں میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اُس کی حفاظت کررہا ہوں، اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے فرماتے ہیں: "وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ۝٣٩" (طٰہٰ:39) یعنی اے موسیٰ! تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے (نگرانی میں) کی جائے۔

وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝٩	اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دئیے) (9)

یعنی: وہ زبان جس سے وہ بولتا ہے، اور اس سے اپنی حالت کی ترجمانی کرتا ہے، اس طرح ہم نے اسے ہونٹ بھی دیے ہیں جو بولنے اور خاموش رہنے اور کھانے میں اس کی مدد کرتے ہیں، اور ساتھ ہی ان دونوں نے اس کے جمال کو اور خوبصورت بنایا ہے، اور ان میں مضبوط کاریگری کا استعمال ہوا ہے۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝١٠	اور ہم نے اسے دو واضح راستے (خیر اور شر) دکھا دیے (10)

اور ہم نے اسے اچھے اور برے دو راستوں کی طرف واضح رہنمائی کردی ہے اور اس کے لیے گمراہی سے ہدایت کو الگ کرکے واضح کردیا تا کہ سعادت کا راستہ اپنا لے اور بد بختی والے راستے سے دور رہے۔

ابن مسعود ؓ نے فرمایا: "النَّجْدَيْنِ" یعنی خیر اورشر، جیسا کہ کہا گیا: (إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا) (مختصر:3/۶۴۱)

لہٰذا ان بے شمار نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا تقاضا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ

(c) ketabton.com: The Digital Library

کی نعمتوں کا شکر ادا کرے، اور گناہوں کے لیے نعمتوں کو استعمال نہ کرے لیکن انسان نے ایسا نہیں کیا ۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ١١	پھر (بھی) وہ مشکل گھاٹی میں نہ (قدم رکھا) گھسا (11)

"الْعَقَبَةَ" دو پہاڑوں کے درمیان کی گھاٹی کو کہتے ہیں، یعنی نجات پانے کے لیے نیک اعمال اور فرض، نفل اور صدقہ کرکے اس کھٹن راستے سے کیوں نہیں گزرتا؟ تاکہ کامیابی حاصل کرتا اور نجات اس کے ہاتھ لگ جاتی۔
محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی میں مال خرچ کرنے کے بجائے اس مشکل راستے کو عبور کرنے کے لیے کیوں خرچ نہیں کیا؟!
البحر میں ہے کہ: "الْعَقَبَةَ" یہ ایک استعارہ ہے، اس سے مراد وہ عمل ہے جس کو انجام دینانفس پر بوجھ بنتا ہو، کیونکہ مال خرچ کرنا نفس کے لیے مشکل اور سخت ہے، عَقَبَہ یعنی: ایک دشوار گزار پہاڑی راستے سے تشبیہ دی گئی ہے، کہ ایسے راستے پر چلنے کا فیصلہ کرنا درحقیقت سختیوں اور مشقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے،"اقتحمها" معنی ہے جلدی اور تیزی سے داخل ہونا، (البحر:476/8)
یہ وہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے نفس، خواہشات اور شیطان کے خلاف جہاد کرنے اور رحمن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بیان کی ہے، نفس سے جہاد کرنا گھاٹی عبور کرنا جیسا ہی ہے، اور آخرت کا راستہ کافی لمبا اور سخت ہے، پس انسان کو چاہئیے کہ اس سخت اور مشکل راستے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری کے ساتھ طے کرے، اگر دنیا کے مال کو دنیاوی لذتوں میں استعمال کرنے کے بجائے عقبہ کے راستے اور آخرت کی راہیں آسان کرنے کے لیے استعمال ہو تو زیادہ بہتر ہوگا، جنت کا راستہ سخت ہے، اس راستے کو آسان کرنے کے لیے مال خرچ کیا جائے تو بہترہے۔
حدیث میں ہے کہ: "حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ" (مسلم: 2822) "جنت ناپسندیدہ اور تکلیف دہ چیزوں سے گھری ہوئی ہے اور جہنم خواشہات سے گھراہواہے"
اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کا راستہ سختیوں اور مشکلات سے ہوکر گزرتا ہے، اور جہنم کا راستہ خواہشات، شہوتوں اور دلی میلان کی پیروی ہے، اس لیے اس راستے پر قدم اٹھانا اور رکاوٹوں اور تنگ اور خطرناک موڑوں اور دشوار گزار اور ناقابل گزر راستوں گھاٹیوں سے گزرنا لوگوں کو چوٹیوں تک

(c) ketabton.com: The Digital Library

پہنچا دے گا، اگر چہ کافی خطرات بھی ہیں، لیکن اس کا خوشگوار نتیجہ نکلے گا، تو لوگ کیوں مشکلات اور سختیوں کو قبول نہیں کرتے؟

ملاحظہ:

دینی امور کو سخت راستہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ خواہشات نفس کے خلاف ہے اسی لیے اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔

وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ۝١٢	اور تمہیں کیا پتہ کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ (12)

کہ جنت تک پہنچنے کے لیے اس کا طے کرنا لازمی ہے، یعنی: تو کیا جانے کہ اس سخت رکاوٹ کا ہونا اور دشوار گزار گھاٹی کیا ہے؟

یہ آیہ مبارکہ اس گھاٹی کی شان کو بڑا دکھانے کے لیے ہے، یعنی تو اس گھاٹی کی دشواری اور سختی اور پھر اس کو پار کرنے اور اس سے گزرجانے کا بدلہ نہیں جانتے ۔

حقیقت یہ ہے کہ جس کو الله تعالیٰ وہاں سے گزرنے کی توفیق عنایت نہ فرمائے تو گزرنا بہت مشکل ہے ، لیکن جسے الله تعالیٰ توفیق دے اس کے لیے آسان ہے۔

پھر الله تعالیٰ بعد والی آیات میں گھاٹی کی تفسیر بیان فرماتا ہے اور اس گھاٹی کو عبور کرنے کے طریقے بیان کرتا ہے۔

فَكُّ رَقَبَةٍ ۝١٣	کسی گردن کو (غلامی سے) آزاد کرنا ہے (13)

الله تعالیٰ کے راستے میں قید سے غلام کا آزاد کرانا اور رہا کرنا ہے، تاکہ اسے آزادی ملےاور اپنے حقوق حاصل ہوں اور اس کی انسانیت کمال کو پہنچے، اسلام آزادی اور حریت دلاتا ہے۔

"رَقَبَةٍ" گردن کے معنی میں ہے عربی زبان میں، لیکن بعض مرتبہ انسان سے کنایہ ہوتا ہے، انسان کا آزاد کرنا، کسی انسان کو آزاد کریں۔

اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِىۡ يَوۡمٍ ذِىۡ مَسۡغَبَةٍ ۝١٤	یا کسی بھوک والے دن کھانا کھلانا (14)

یعنی: کھانا کھلانے کا اقدام کریں، بھوکوں کو کھانا کھلانا، کونسے دن؟ اس دن جب قحط پڑے ، کھانا کھلانا ہمیشہ سے اسلام میں مقبول اور پسندیدہ امر رہا ہے، اور دین اسلام میں ہمیشہ اس کی تشویق اور ترغیب دی گئی ہے،البتہ قحط والے دن اس کھلانے کی قدر و قیمت اور ثواب یقیناً زیادہ اور خاص ہے، کیونکہ "ذِىۡ مَسۡغَبَةٍ" جس دن وہ بھوکے ہوں، یعنی: قحط کے ایام ہو۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

مفسر صاوی فرماتے ہیں: کھانا کھلانے کو بھوک کے دن سے مقید کیا ہے، چونکہ ایسے دن میں کھانا کھلانا نفس پر سخت اور بھاری ہے، (تفسیر صاوی:342/4)

جیسا کہ ہم نے کہا: کھانا کھلانا بطور عام مطلوب ہے، یہ کہ انسان کھانا کھلانے والا ہو، چاہے مستحق افراد کے لیے ہو، یا غیر مستحق افراد کے لیے ایک پسندیدہ کام ہے، لیکن یہ کہ کس وقت اس کی اہمیت زیادہ ہے اور اجر و ثواب جو مطلوب ہے اسے حاصل کرے اور خاص شرائط کیاہیں؟ تو: اس سے مراد وہ بے بس شخص ہے جو غربت کی انتہاء کو پہنچ چکا ہو، اور اس کے لیے کوئی راستہ نہیں بچا ہو، وہ فقیر جو آہستہ آہستہ ایمان کی کمزوری اور کفر کی طرف جارہا ہے، ایسے افراد اور اشخاص کی: اگر مدد کی جائے تو یہ قیمتی ہوگا، آیت کا سادہ سا معنی یہ ہے کہ جو بھوکا ہے اسے کھانا کھلائیں۔

يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ۱۵ۙ○	کسی قرابت والے یتیم کو (15)

یعنی: وہ بچہ جس کے ماں باپ نہ ہوں، اور نہ کوئی ایسا ہو کہ اس کا خیال رکھے اس کی دیکھ بال کرے، وہ شکستہ دل اوراحساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے۔

یتیموں کے ساتھ نیکی کرنا ثواب ہے اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی، اورجہاں یہ دو اکھٹے ہوں تو وہاں ثواب دوگنا ہے۔

اسی طرح: یتیم ہر زمانے میں معاشرے کا محروم ترین طبقہ ہے، چنانچہ یتیم ہونا بلوغت سے پہلے ہے، بلوغت کے بعد اگر باپ نہ بھی ہو تو وہ یتیم شمار نہیں ہونگے، تو اب کیوں اس آیت اور دیگر بابرکت آیات میں یتیم اور مسکین کی بحث زیادہ آئی ہے؟ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان دو قسم کے افراد کا سب سے زیادہ نام لیتا ہے؟ اس کی علت اور وجہ یہ ہے کہ: معاشرے کا محروم ترین طبقہ یتیم ہیں، وہ بھی وہ یتیم جو کسی شخص کی قوم، رشتہ داروں اور اقارب میں سے ہو۔

حدیث میں ہے کہ: (الصدقة على المسكين صدقة.وعلى ذي الرحم اثنتان:صدقة وصلة) ترجمہ: "صدقہ مسکین پر صرف صدقہ ہے، رشتہ دار اور قریبی آدمی پر دو چیزیں ہیں: صدقہ اور صلہ رحمی"

اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ۱٦ؕ○	یا مٹی میں ملے ہوئے کسی مسکین کو (١٦)

متربہ، تراب سے لیا گیا ہے، اور تراب کا معنی مٹی ہے، اس مسکین کو کہا جاتا ہے جس کے بود و باش کے لیے کوئی مکان نہ ہو، مٹی میں پڑا ہوا ہو، یہ کنایہ ہے شدید فقر اور غربت سے۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

ابن عباس ؓ فرماتے ہیں: وہ ایسا غریب ہے جس کے پاس کپڑا یا کوئی اور چیز نہیں ہے کہ اسے مٹی سے بچائے، پس خاکنشین اور خاکسار رہتاہے۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝١٧	پھر ہوئے وہ ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی (۱۷)

ان آیات میں جس اہم چیز کی طرف ہمیں توجہ دینی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہمارے رب نے انسان کو سعادت کی بلندیوں تک پہنچانے کے لیے اجتماعی مسائل جیسے یتیموں کی دیکھ بال، بھوکوں کو کھانا کھلانا، انسانوں کو آزاد کرنا وغیرہ کے ضمن میں ایک معنوی مفہوم بھی رکھاہے اور وہ یہ کہ اللہ پر ایمان لانا اور تمام خدمت خلق کے امور انجام دینا ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، خدا پرستی اور خدمت خلق ساتھ ساتھ ہیں ۔

یعنی دین اسلام میں مادی اور معاشرتی مسائل روحانی اور خدا پرستی سے الگ نہیں ہوتا، لہٰذا بعض آیات میں فرماتا ہے:"ان الذين آمنوا وعملوا الصالحات"کہ "آمنوا" سے مراد ذہنی اور روحانی پہلو ہے، جبکہ "عملوا الصالحات" اجتماعی مناسب کاموں کی طرف اشارہ ہے، اگر کوئی شخص کمال کی راہ پر قدم رکھنا چاہتا ہے، وہ در حقیقت کمال کے دشوار گزار میدانوں میں داخل ہونا اور انہیں طے کرنا چاہتا ہے،اور ساتھ ہی ایمان کے میدان میں بھی آگے جانا چاہتاہے ، اور معاشرتی اخلاقیات کے میدان میں بھی، اسے اچھے معاشرتی اخلاقیات اور خاص طور پر ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا ہوگا: اور وہ بھی تومشکل حالات میں خاص کرجو کسی معاشرے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔

چار چیزیں جن کے تحت آپ اس گھاٹی کو عبور کرسکتے ہیں

1 - غلام آزاد کرنا جو روایت میں موجود ہے: جس نے کسی مؤمن غلام کو آزاد کیا جہنم کی آگ سے اس کا فدیہ ہوگا، حدیث شریف میں ہے کہ: (أَيُّمَا رَجُلٍ أَعْتَقَ امْرَأً مُسْلِمًا، اسْتَنْقَذَ اللَّهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ عُضْوًا مِنْهُ مِنَ النَّارِ) (بخاری 2517 و6715 ومسلم 1509) ترجمہ: "جس نے کسی مؤمن گردن کو آزاد کیا، اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے (اس آزاد کرنے والے کا) عضو آگ سے آزاد کرے گا"

2 - بھوک اور غربت وافلاس کے دورمیں کھانا، خاص طور پر کسی ایسے یتیم کو جو رشتہ دار ہو یا قریب کا رہنے والا ہو، یا کسی غریب کے لیے جو مٹی میں رُل رہا ہو اور انتہائی فقیر ہو۔

3 - سچا ایمان خدا پر، خدا کے رسول پر، خدا کی آیات پر اور خدا کی ملاقات

(c) ketabton.com: The Digital Library

پر، تاکہ اس کا دل اس سے زندہ رہے۔

4 - مظلوم مؤمنوں کو صبر کرنے اور حق پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتاہے ، اور مالداروں اور امیروں کو سمجھاتا رہے کہ غریبوں اور مسکینوں پر رحم و مہربانی کیاکریں۔

ان چار چیزوں کے ذریعے انسان اس عاقبت کی گھاٹی کے پار جاسکتا ہے اور خود کو عذاب سے نجات دلا سکتا ہے،یعنی انسان کو اپنا مال خرچ کرنا چاہیے اور صالح مؤمن رہنا چاہیے۔

أُولَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلۡمَيۡمَنَةِ١٨ۚ	یہی لوگ صاحب سعادت ہیں (١٨)

یعنی مذکورہ صفات والے وہ صالح لوگ ہیں جو نجات پانے والوں کی صف میں شامل ہوں گے، جو اپنا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں وصول کریں گے، اور جب وہ نعمت والے باغوں میں داخل ہوں گے تو خوش ہوں گے، بعض مفسرین نے "مَيۡمَنَةِ" کو مصدر میمی سے بہ معنی زیادہ اور استمرار کے خیر اور برکت میں لیا ہے، اور بعض نے اسم مکاں کہا ہے، جس کا معنی خیر اور برکت کا مقام ہے۔ (التفسیر الکبیر:جلد ٢٧، صفحہ:١۴٣)

اصحاب یمین اور میمنہ کا قرآن عظیم کی اصطلاح کے مطابق ان لوگوں پر اطلاق ہوتا ہے جنہوں نے دنیا میں ایمان اور نیک اعمال کےساتھ زندگی گزاری ہو، جیسا کہ ہم نے کہا: قیامت کے دن اپنا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں حاصل کریں گے، قرآن کریم نے لوگوں کو قیامت کے دن تین گروہوں (سابقون، اصحاب یمین، اصحاب شمال) میں سے ایک قرار دیا ہے: "و كُنتُم أَزۡوَاجًا ثَلَٰثَة فَأَصۡحَٰبُ ٱلۡمَيۡمَنَةِ... وأَصۡحَٰبُ ٱلۡمَشۡـَٔمَةِ...والسّٰبِقون" اور بعض دوسرے مواقع پر اصحاب یمین کو اصحاب شمال کے مقابل اور اصحاب میمنہ کو اصحاب مشئمہ کے مقابل قرار دیا ہے۔

کتاب اللہ اور احادیث نبوی کے نصوص کی بنیاد پر انسانوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے:

1 - ایسے لوگ ہیں جن کا ایمان اور توحید درست ہے، اور ان کے نیک اعمال بہت ہیں، یہ لوگ جنتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں سے درگزر فرمائے گا، (وَبَشِّرِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ أَنَّ لَهُمۡ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُۖ) (سورہ بقرہ:٢٥) ترجمہ:"اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنا دوکہ ان کے لیے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔"

(c) ketabton.com: The Digital Library

2 - ایسے لوگ ہیں جن کا ایمان اور توحید صحیح ہے: لیکن بہت زیادہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، جوکہ فسق کے حد کو پہنچ چکے ہیں، یہ افراد جہنم کے مستحق ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ دو طرح کا معاملہ کرسکتا ہے: اپنے فضل اور مہربانی سے ان کے گناہوں سے درگزر کرکے ان کو جہنم سے نجات دے گا، یا پھر ان کو جہنم میں بھیج کر گناہوں کی سزا دے کر ایک دن ان کو دوبارہ باہر نکالے گا:(لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۸۴) (سوره بقره:۲۸۴) ترجمہ:"جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ تو اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کرو یا چھپاؤ خدا تم سے اس کا حساب لے گا پھر وہ جسے چاہے مغفرت دے اور جسے چاہے عذاب دے۔"

3 - وہ جن کا ایمان اور توحید صحیح نہ ہو، اس قسم کے لوگ جہنم میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، کبھی بھی اس سے نہیں نکلیں گے، اسی طرح عالم برزخ کے بارے میں، کتاب اللہ اور احادیث کے نصوص سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگ .

أ: قبر یا عالم برزخ میں۔

ب: یا جنت کے باغیچوں میں سے کسی ایک باغیچہ میں ہوں گے۔

ت: یا جہنم کے گڑھوں میں سے کسی ایک گڑھے میں ہوں گے۔

جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهُ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ إِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَمِنْ أَهْلِ النَّارِ فَيُقَالُ هَذَا مَقْعَدُكَ حَتَّى يَبْعَثَكَ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) بخاري (1379)، وصحيح مسلم (2866)

ترجمہ: "جب تم میں سے کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو ہر صبح و شام اس کا اصل ٹھکانا اس کے سامنے لایا جاتا ہے، اگر وہ جنت والوں میں سے ہے تو اہل جنت سے اور اگر وہ دوزخ والوں میں سے ہے تو دوزخ میں سے (اس کا ٹھکانا اسے دکھایا جاتا ہے اوراس سے) کہا جاتا ہے یہ تمہارا ٹھکانا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تجھے زندہ کرکے اس (ٹھکانے) تک لے جائے۔"

ضروری نہیں کہ جو لوگ عالم برزخ میں خوش ہوں وہ قیامت کے دن ناخوشی میں رہیں، بلکہ مذکورہ بالا حدیث اس کے خلاف ثابت کرتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوگا کہ کوئی عالم برزخ میں تکلیف اور عذاب میں ہوگا اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے جنت میں بھیج دے گا، برزخ کے سختی اور عذاب کو اس کے گناہوں

(c) ketabton.com: The Digital Library

کے پاکی کا سبب بنادے کہ صحرائے محشر میں اس کے گناہ کم ہوجائیں، اور یہ شائستہ اور لائق بندوں میں سے ہو۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ١٩ ○	اور جنھوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا وہ بدبخت ہیں (١٩)

"أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ" قرآن کریم میں اصحاب الشمال کی دوسری تعبیر ہے، قرآن کریم نے اصحاب شمال کو دوسرے القاب کے ساتھ بھی ذکر کیا ہے: "مکذّبین"، "ضالّین" "کافر"، "أعمی"، "مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ" و "مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ○" اس جماعت اور گروہ کو اصحاب شمال کے نام سے منسوب کرنے کی وجہ مندرجہ ذیل طریقے سے بیان کی جاسکتی ہے:

1- ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں دیےجائیں گے، اور یہ ان کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہے، کیونکہ عرب دائیں ہاتھ خط لینے کو قبولیت اور احترام کی علامت سمجھتے ہیں، اور بائیں ہاتھ سے رد اور توہین کی علامت سمجھتے ہیں۔
2- انہوں نے اپنی زندگی باطل پرستی، خواہش پرستی اورنافرمانی میں گزاری اور خدا کی آیات سے کفر کرتے ہوئے حق اور سعادت کے راستے کے خلاف چلے ، ان کا انجام جہنم اور دیگربہت سے عذاب ہوں گے۔
3- کائنات کے دو رُخ ہیں، دائیں اور بائیں، دائیں جانب ملکوت اعلیٰ ہیں۔ اور بائیں جانب ملکوت اسفل اور بدبختوں کی ارواح کی جگہ اور عذاب کے فرشتوں اور برائیوں کے لکھنے والے فرشتوں کی جگہ ہےاور بدکرداروں کے لیے جہنم ہے۔

جہنم میں اصحاب شمال کے جانے، ان کے دردناک عذاب اور آخرت میں ان کے حال اور کیفیت کے بارے میں بتانے والی آیات سے اصحاب شمال کےجہنم میں جانے کے اسباب اور ان کے عذاب کے بارے میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے:

دل کا اندھا ہونا

قرآن کریم نے اصحاب شمال کو اصحاب یمین کے مقابل بیان کیاہے اور اصحاب یمین کے مقابل گروہ کو دنیا میں نابینا اور اندھا کہا ہے، چنانچہ اس سے اس طرح نتیجہ لیا جاسکتا ہے کہ اصحاب شمال دل کے اندھے ہیں،
ان کے دل کا اندھا ہونا قیامت میں ان کے نابینا ہونے کا سبب بنے گا۔

(c) ketabton.com: The Digital Library

زیاده نعمتوں کا مالک ہونا

اصحاب شمال دنیا میں نعمتوں میں سر تاپا ڈوبے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ عبرت حاصل کرنے سے غافل ہیں، وہ لوگ جسمانی راحت اور سکون پانے کے لیے اپنے فرائض چھوڑ دیتے ہیں، اللہ نے خواہشات کی قوت انسان کی ترقی اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اس کے جسم میں رکھی ہے، البتہ حد سے زیادہ کھانا پینا اور دیگر خواہشات کی تکمیل اور حصول ان کو فرائض سے غفلت برتنے اور ترک کرنے کی بنیاد فراہم کرتے ہیں، اس لیے انہوں نے خواہشات کی قوت جوکہ ترقی اور کمال کا ذریعہ ہوسکتی تھی، اپنے زوالـہ استعمال کی:

عَلَيۡهِمۡ نَارٌ مُّؤۡصَدَةٌۢ ۝٢٠	ان پر (ہر طرف سے) آگ بند کی جائے گی (۲۰)

جنہوں نے کفر کیا اور ان احکام کو پس پشت ڈال دیا، خدا کو تسلیم نہیں کیا اور اس پر ایمان نہیں لائے، اور نیک عمل نہیں کیے اور اللہ کے بندوں پر رحم نہیں کیا، یہی لوگ شقی اور بدبخت ہیں، ان پر ایسی آگ مسلط کی جائے گی کہ جس کے دروازے اونچے ہوں گے کہ اس سے باہر نہیں نکل سکیں گے، اور یہ لوگ سختی و مصیبت میں رہیں گے۔

صبر کی اہمیت اور مقام

صبر واضح ترین انسانی اخلاقیات میں سے ایک ہے، علماء کہتے ہیں کہ صبر اسلامی اخلاقیات کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے، باقی تمام طرز سلوک اسی کےگرد گھومتا ہے اور صبر ہی اس کا منبع ہے، اور اگر ہم انسانی خوبیوں میں سے ہر خوبی پر پوری توجہ دیں تو ہم پوری وضاحت کے ساتھ پائیں گے کہ: اس کی بنیاد اور مرکز صبر ہے۔

انسان کو اپنی زندگی کی راہ میں تین قسم کے صبر کی ضرورت ہوتی ہے اور صبر کی تینوں قسمیں قرآن عظیم میں بیان ہوئی ہیں، جیسے:

1 - اللہ کی اطاعت میں صبر

یعنی تمام نفسانی اور شیطانی خواہشوں کے خلاف مزاحمت اور دین پراستقامت کرنا اور انتھک کوششوں کے ساتھ خدا کی عبادت اور دوسرے انسانی فرائض اور مقاصد انجام دیتے رہنا۔

2 - اللہ تعالیٰ کی معصیت کے مقابلے میں صبر کرنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ روح کو گناہ کی دلدل میں گرنے اور اللہ اوراس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں اور احکام کی نافرمانی سے بچانا۔

3 - زندگی کے دردناک واقعات کے مقابلے میں صبر کرنا

یعنی اس حقیقت کا ادراک کرنا کہ زندگی کا ایک رخ اداسی اور دوسرا رخ خوشی کا ہے، مصیبت کے وقت انسان کو نا امید نہیں ہونا چاہیے ، بلکہ خود کو خدا کے حوالے کرنا چاہیے، جو کچھ اس نے چاہا ہے اس پر راضی ہو، یہ

(c) ketabton.com: The Digital Library

صبر کی تیسری صورت ہے جس کا ذکر قرآن میں بکثرت آیا ہے، جو صبر اس طرح کا نہ ہو تو اس کا کوئی ثواب ہے نہ کوئی قدر، خدا نے قرآن میں صرف ان لوگوں کی توصیف کی ہے جو اس کی رضا کی خاطر صبر کرتے ہیں اور مستقبل کے کامیابی کو ان کے لیے بتایا ہے: یہ بات ذہن میں رہے کہ تینوں قسم کے صبر کا محرک رب کی رضا ہونا ضروری ہے، جیسا کہ خود رب تعالیٰ نے فرمایا ہے: (ولربك فاصبر)، (وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ) (رعد:22)

صبر کا لغوی معنی:

روکنا اور حفاظت کے معنی میں ہے، صبر جمیل وہی صبر ہے جس میں آہ و فغان اور واویلا نہ ہو: (فَصَبْرٌ جَمِيلٌ) (سورہ یوسف: ۱۸) (اس لیے خوبصورت صبر کو اپنائیں) یہ بات قابل ذکر ہے کہ "صبور" پروردگار کے ناموں میں سے ایک ہے۔

اصطلاح میں:

علماء صبر کی اصطلاحی تعریف میں فرماتے ہیں: صبر خدا کی کتاب قرآن عظیم اور رسول خدا کی سنت کے احکام پر استقامت اور ثابت قدمی ہے۔

قرآن کریم جنت میں داخل ہونے کی چابی کو صبر کہا گیاہے، علماء فرماتے ہیں: ایمان کا معیار، انسان کی زینت صبر ہے، اور عظمت تک اس کے پہنچنے کا راستہ صبر ہی ہے، انسان صبر سے سکون پاتا ہے، اور صبر کی سرزمین میں مکمل آسانی حاصل کرلیتا ہے، قرآن کریم میں لفظ صبر ستر مرتبہ سے زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔

صبر کے مقام اور مرتبہ کے بارے میں یہی کافی ہے کہ ہمارے عظیم رب نے سورہ زمر کی آیت "۱۰" میں فرمایا: (إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۝۱۰)

ترجمہ: "جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے حساب ثواب ملے گا"

ایک مخلص مسلمان آزمائشوں اور مصیبتوں کا سامنا کرتے وقت جو سب سے بہتر کام کرسکتا ہے وہ ہے صبر ، اور الله کے فیصلوں کے سامنے خدا کے اجر و ثواب کا انتظار ۔

اگر انسان کا صبر شہوت کے خلاف ہو تو اسے "عفت" کہتے ہیں، اگر انسان کا صبر ناخوشی کو برداشت کرنے کے لیے ہو تو وہ "قناعت اور خدا کے سامنے سر تسلیم خم" کرنا ہے ۔

اگر صبر نعمتوں اور شکر کے لیے ہو تو اسے ضبط نفس اور حکمت کہا جائے گا اور اگر صبر مقدس جہاد میں ہو تو اسے "شجاعت" کہا جائے گا، اگر انسان کا صبر دوسروں کی حماقت اور بدتمیزی کے خلاف ہو تو اسے "برداشت اور

(c) ketabton.com: The Digital Library

حلم" کہا جائے گا، اور اگر دوسروں کے راز چھپانے کے لیے ہو تو اس کا مالک "امین اور سچا" کہلائے گا، اور اگر کسی شخص کا صبر زندگی میں زیادتیوں کے خلاف ہو تو اسے "زہد" کہتے ہیں، یہی منطق ہے کہ صبر نہ کرنے والا اپنی زندگی کمزور اور بے اختیار ہوجائے گا اور کسی دباؤ کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔

حساب و کتاب سے پہلے جنت میں جانا

روایت ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ اپنے اعمال کے حساب و کتاب کے لیے جمع ہوں گے، ایک منادی پکارے گا: صبر کرنے والے کہاں ہیں؟ تاکہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں۔

لوگوں کا ایک گروہ کھڑا ہوگا، فرشتے اس کو دیکھ کر کہیں گے: کہاں جارہے ہو اے آدم کے بیٹو؟

کہیں گے: جنت، فرشتے کہیں گے: حساب سے پہلے؟

کہیں گے: جی ہاں، فرشتے ان سے پوچھیں گے: تم کون ہو؟ کہیں گے: ہم صابرین ہیں۔

فرشتے پوچھیں گے: آپ لوگوں کا صبر کیا تھا؟

کہیں گے: خدا کی اطاعت پر ہم نے صبر کیا، خدا کی معصیت اور گناہ کے مقابلے میں صبر کرتے رہے جب تک اللہ نے ہمیں موت دی۔

فرشتے کہیں گے: آپ لوگ ایسے ہی ہو جیسے کہتے ہو، جنت میں داخل ہوجائیں کیا ہی اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔

خدا جل جلالہ اس بارے میں فرماتے ہیں: "إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (سورہ زمر:۱۰)

لوگوں کے ساتھ صبر اور حوصلہ

ابو سعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں، کہ اللہ کے نبیوں میں سے ایک نبی کا قصہ سنا رہےتھے کہ اس نبی کو لوگوں نے ما را پیٹا اور اس کے جسم کو خون سے آلود کردیا، اور جب وہ اپنے چہرے سے خون پونچھ رہےتھے کہا: (اللهم اغفر لقومي فإنهم لا يعلمون) (متفق علیہ) ترجمہ: "اے میرے رب: میری قوم کی غلطیوں کو معاف فرما کیونکہ وہ ناداں ہیں۔"

ایک دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ تھے، کہ زید بن سُعنہ نام کا ایک یہودی شخص آپؐ کے پاس آیا اور اپنے قرض کا مطالبہ کیا، اس نے آپ کی قمیص اور عبایا پکڑی اور غصے بھرے چہرے کے ساتھ آپؐ کی طرف دیکھا اور بولا: اے محمد کیا تم میرا حق نہیں دیتے ہو؟ آپ سے سخت

(c) ketabton.com: The Digital Library

اور جارحانہ انداز سے بات کی، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یہودی کی اس حرکت سے بہت زیادہ غصہ ہوگئے، شدید غصے کی وجہ سے ان کی آنکھیں گھومنے والے جھولے کی طرح گھوم رہی تھیں اور کہا: اے اللہ کے دشمن! کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح بات کرتے اور جارحانہ انداز اختیار کرتے ہو، اس خدا کی قسم جس نے ان کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر اس کی ملامت کا خوف مجھے نہ روکتا تو میں ابھی تمہارا سر تن سے جدا کردیتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نےبڑے سکون اور اطمینان سے عمر کی طرف دیکھا اور فرمایا: میں اور یہ معزز آدمی اس رویے کے علاوہ کے محتاج ہیں، تمہیں مجھ سےکہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض اچھی طرح چکا دوں، اور اسے اپنا حق اچھی طرح سے مانگنا چاہئیے، اے عمر! جاؤ اس کا قرض ادا کرو اور اسے بیس (۲۰) اضافی کپ کھجوریں دیدو۔

زید یہودی کہتا ہے: جب عمر نے ۲۰ کپ کھجوریں بڑھا کردیں، تو میں نے کہا: یہ زیادہ کیا ہے؟

حضرت عمرؓ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ تیری دشمنی اور بغض کے مقابلے میں بیس (۲۰) کپ بڑھا کردوں۔

زید نے کہا: اے عمر مجھے جانتے ہو؟ عمر نے کہا: نہیں تم کون ہو؟ اس نے کہا: زید بن سُعنہ، عمر نے کہا: زید پڑھا لکھا یہودی عالم؟ کہا: جی ہاں، عمرؓ نےکہا: کس چیز نے تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدتمیزی پر آمادہ کیا اور بُرا بھلا کہا؟

زید نے کہا: پیغمبری کے تمام علامات میں محمد میں دیکھتا تھا، دو چیزوں کے علاوہ:

1 - کہ کیا ان کا غصہ اس کے بردباری پر غلبہ پاتا ہے؟
2 - اور کیا اس کے سامنے شدید جہالت اسے مزید بردبار ہونے پر آمادہ کرتی ہے، میں نے چاہا کہ اس کا امتحان لوں، اب تجھے گواہ بنا کر کہتا ہوں: (رضیت باللہ رباً وبالإسلام دنیاً وبمحمد نبیاً) ترجمہ:"میں اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہوں"

اور تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نےاپنے کل مال و دولت کا آدھا حصہ امت محمد کے مسلمانوں کے لیے بخش دیا۔

عمر ؓنے کہا: لیکن مال کی یہ مقدار ان کے لیے کافی نہیں ہوگی، اس مال کو ان میں سے بعض کے لیے بخش دیا۔

پھر زید یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آگیا اور کہا: (أشهد

(c) ketabton.com: The Digital Library

أن لا إله إلاَّ الله وأشهد أن محمداً عبده ورسوله) ترجمہ:"گواہی دیتا ہوں میں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہے"
اس طرح اس پر ایمان لایا اور تسلیم کیا، (حاکم نے المستدرک میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے)

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library